عربی تنقید پر قرآنِ مجید کے اثرات

از جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے، بی، ٹی، ایچ " علیگ "
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ

قرآن مجید کو عربوں کی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسلام کے بعد محض تشریعی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ قرآن مجید ان کی زبان، ادب اور ذہنی رجحانات کا بھی محور بن گیا۔ عربی زبان ولغت کی تدوین، اشعار کی تلاش وتحقیق، اسالیبِ بیان کے ارتقاء اور مختلف فنونِ ادب کے پروان چڑھنے میں قرآن مجید ہی سب سے بڑا محرک تھا۔ عربوں نے قرآن کا مطالعہ مختلف نقطۂ نظر سے کیا ہے، یہاں میں اس مطالعہ کا صرف ایک پہلو یعنی جو کچھ قرآن مجید کی زبان اور اسلوبِ بیان پر لکھا گیا ہے اسے پیش کرنا چاہتا ہوں، قرآن مجید کے محاسنِ زبان پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور علماء نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز کا اصل مظہر اس کی زبان اور بلاغت ہے اس سے عربی تنقید کو بہت فائدہ پہونچا۔ علماء نے نہ صرف قرآن مجید ہی کی زبان سے وقیع اور فنی بحثیں کی ہیں بلکہ وہ عربوں کی عام زبان، اسالیبِ بیان، جاہلی واسلامی شعراء کے اشعار، عربوں کی روایات نحو، علمِ بدیع، علمِ بیان، علمِ معانی اور لغت وغیرہ کے دقیق مسائل کو بھی زیرِ بحث لائے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن فہمی کے لئے عربی علوم وفنون کا عمیق مطالعہ درکار ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ جب تک عرب قبل اسلام کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ نہ ہو اور عربی بلاغت پر نظر نہ ہو اس وقت تک کما حقہٗ قرآن مجید پر نظر نہیں ہوسکتی۔ [1]

---

[1] کتاب نظام القرآن، مؤلفہ حمید الدین فراہی ملاحظہ ہو مقدمہ از علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

قرآن مجید اور عربی تنقید دونوں میں ایک بہت قریبی تعلق ہے اور جن لوگوں نے قرآن مجید کی زبان و اسلوبِ بیان پر کتابیں تصنیف کی ہیں وہ سب کے سب ناقدِ ادب تھے اور ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جنھوں نے عربی تنقید پر الگ سے بھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں عربی تنقید کے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں، اس سے قبل کی کوئی کتاب موجود نہیں، اسی دور سے ناقدینِ عرب نے قرآن کی جانب بھی توجہ کی، مشہور نحوی فرّاء نے (متوفی ۲۰۷ھ) ایک کتاب "معانی القرآن" کے نام سے لکھی، ابو عبیدہ (متوفی ۲۰۹ھ) نے "مجاز القرآن" تصنیف کی، اور تیسری صدی کے مشہور ناقد ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) نے "مشکل القرآن" لکھی، یہ تینوں کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں، ابن قتیبہ مشکل القرآن میں کہتے ہیں کہ "قرآن کی عظمت کا عرفان اُسی کو ہو سکتا ہے جس کی نظر میں وسعت ہو جس کا علم عمیق ہو اور وہ عربوں کے مختلف اسالیبِ بیان و مکتبہائے فکر سے واقف ہو۔[1]

تمام ناقدینِ عرب نے بلا کسی استثناء کے قرآنِ مجید سے مثالیں پیش کی ہیں، قدامہ بن جعفر نے بہت کم آیات بطور مثال کے اپنی کتاب "نقد الشعر" میں پیش کیں مگر چوتھی ہی صدی ہجری کا ایک دوسرا ناقد ابوالحسن اسحاق بن وھب الکاتب نے اپنی مشہور کتاب "البرھان فی وجوہ البیان" میں بے شمار آیاتِ قرآنی سے استشہاد کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اُس نے نظریات تو اخذ کئے ارسطو سے مگر مثالیں دیں قرآن مجید سے۔ ارسطو کی کتاب الجدل، کتاب الشعر اور کتاب الخطابۃ کے اثرات مذکورۂ بالا کتاب پر بالکل واضح ہیں[2] یہ عجیب طرز تھا کہ عرب ناقد ارسطو اور دوسرے یونانی مفکرین سے نظریات و اصطلاحات اخذ کر کے ان کے لئے مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے تلاش کرتے تھے چنانچہ ابن معتز نے تیسری صدی ہجری میں، ابن وھب الکاتب نے چوتھی صدی ہجری میں اور عبدالقاہر

[1] اثر القرآن فی تطور النقد الأدبی تالیف زغلول سلام مطبوعہ دار المعارف مصر ص ۱۰

[2] نقد النثر تالیف قدامہ بن جعفر، ملاحظہ ہو "مقدمۃ" فی البیان العربی" از طٰہٰ حسین (یہ کتاب قدامہ کی جانب غلط منسوب ہے، یہ ابن وھب الکاتب کی تصنیف ہے اور کتاب کا نام نقد النثر نہیں بلکہ "البرہان فی وجوہ البیان" ہے)

الجرجانی نے پانچویں صدی ہجری میں بالکل یکساں طریقہ اختیار کیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے پانچویں صدی اور اس کے بعد کے اکثر ناقدوں نے اپنی کتاب کے دو مقاصد قرار دیئے، ایک دینی مقصد اور دوسرا ادبی، انھوں نے قرآن مجید میں تنقید کی بنیادیں تلاش کیں بالکل اسی طرح جس طرح انھوں نے جاہلی شاعری وغیرہ کو مرکزِ توجہ بنایا۔ چنانچہ ابوالہلال عسکری نے اپنی کتاب "سر الصناعتین" کے مقدمہ میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ میری کتاب کے دو اہم مقاصد ہیں، ایک ادبی خدمت اور دوسری دینی خدمت، بالکل یہی انداز ابن سنان خفاجی نے "سر الفصاحۃ" میں اختیار کیا ہے، عبدالقاہر جرجانی نے تو مستقل دو کتابیں ہی دونوں مقاصد پر لکھیں، بلاغت پر ان کی کتاب "اسرار البلاغہ" بہت مقبول و مشہور ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی زبان اور اس کے محاسن پر ان کی کتاب "دلائل الاعجاز" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، ان دونوں کتابوں میں انھوں نے جہاں مثالیں اشعارِ عرب سے دی ہیں وہاں قرآن مجید سے بھی پیش کی ہیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے، جاحظ نے تیسری صدی ہجری میں ایک بحث یہ اٹھائی تھی کہ کلام میں حُسن کا مرجع الفاظ ہیں یا معانی؟ انھوں نے الفاظ کو معانی پر ترجیح دی تھی، اور بتایا تھا کہ معانی تو دیہاتی، شہری اور جاہل سب ہی جانتے ہیں، اصل حسن تو الفاظ کے قالب میں ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے اس نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ حسن الفاظ میں نہیں معانی میں پوشیدہ ہے۔ "دلائل الاعجاز" میں انھوں نے اسی نظریہ کو اس طرح پیش کیا کہ قرآن میں بھی حسن کلام کا مرجع الفاظ میں نہیں معانی میں ہے اور معانی میں بھی براہِ راست نہیں بلکہ نظمِ معانی میں کیفیتِ حسن پوشیدہ ہے۔

ابوتمام کی شاعری عربوں کے مالوف طرزِ شاعری سے مختلف تھی، اس میں استعارے، تشبیہات، نئے مضامین اور نئی تراکیب کثرت سے استعمال کی گئی تھیں اور ساتھ ہی فلسفیانہ خیالات بھی کسی حد تک پیش کئے گئے تھے، یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے عربوں نے اجنبیت محسوس کی اور عرب ناقدین دو طبقوں میں منقسم ہو گئے، بالکل یہی صورتِ حال متنبی کے ساتھ بھی پیش آئی اس لئے کہ اس نے بھی ابوتمام کا طرز اختیار کیا اور اُس سے بہت آگے بڑھ گیا اور اس کے بارے میں بھی نقادِ عرب دو گروہوں میں بٹ گئے۔

صاحب بن عباد اور حاتمی وغیرہ نے بہت کچھ اس کے خلاف لکھا مگر قاضی جرجانی اور ثعالبی وغیرہ نے اسکی موافقت میں بہت اچھے انداز سے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔

ابوتمام کی شاعری کے اختلافات سے دراصل "علمِ بدیع" کا آغاز ہوا اس لئے کہ اس کی بیشمار اقسام کا استعمال اس کی شاعری میں ہوا تھا۔ اُس وقت یہ عام خیال تھا کہ یہ بالکل ایک نیا علم ہے جو عربوں میں یونانیوں سے آیا ہے۔ ابن معتز (متوفی ۲۹۶ھ) نے کتاب البدیع تصنیف کی اور اس میں یہ نظریہ پیش کیا کہ "علمِ بدیع" عربوں کے یہاں ایامِ جاہلیت سے موجود ہے اور تمام عرب جدید و قدیم شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں بھی موجود ہے ابن معتز نے کثرت سے قرآنی آیات سے استشہاد کیا۔

"مذہب بدیع" کے حاملین نے قرآن مجید سے خاص طور سے کیوں مثالیں پیش کیں؟ اس کا جواب زغلول سلام نے یہ دیا ہے کہ اس طرح انھوں نے یہ کوشش کی کہ جو کچھ ابوتمام اور ان کے مقلد شعراء نے کیا تھا اس کو صحیح ثابت کریں، آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ علمِ بدیع کے حامیوں نے یہ کوشش کی کہ شعر و نثر کو فن و "صنعت" کی شکل میں پیش کریں تو جو پیمانے انھوں نے ان کے لئے گھڑے ان کا سلسلہ اعجازِ قرآن سے ملا دیا۔[1]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید عربی تنقید کے ہر موڑ پر سامنے آتا ہے، ویسے یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جس کتاب سے اتنی کثرت سے نمونے اور مثالیں اخذ کی جائیں گی اُس کے اثرات پڑنے یقینی ہیں خواہ وہ ظاہر ہوں یا غیر شعوری طور پر زبان و بیان اور ان کے پرکھنے کے معیار میں رچ بس جائیں۔

علمِ بدیع کے علاوہ علمِ بیان اور معانی پر بھی قرآن مجید کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں اور بیشمار آیات ناقدینِ عرب نے قرآن مجید سے پیش کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اسلوب کا اصل معیار ہمیشہ قرآن مجید رہا ہے اور ناقدوں نے اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ قرآن مجید نے کس انداز سے اور کن الفاظ و تشبیہات کے ذریعہ مفہوم کو ادا کیا ہے اور اسی کو معیارِ حسن و بلاغت سمجھا ہے۔

---

[1] اثر القرآن فی تطور النقد الأدبی، ص ۳۳۷

اعجاز القرآن پر رُمّانی (متوفی ۳۸۴ھ) اور خطابی (متوفی ۳۸۸ھ) کی کتابیں بہت اہمیت رکھتی تھیں، رمانی کی دس اقسامِ بدیع مشہور ہیں۔ ان کو ابوبکر باقلانی نے بھی اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں نقل کیا ہے، یہ اقسام دراصل چوتھی صدی ہجری میں معروف ہو چکی تھیں ہاں بعض اختلافات البتہ قابلِ ذکر ہیں:-

(۱) رُمّانی نے اطناب اور تطویل کا فرق اعجاز القرآن میں واضح کیا ہے۔

(۲) تلاؤم اور اس کی مختلف قسموں اور تنافر کے درمیان فرق کو بھی انھوں نے بیان کیا ہے۔

(۳) فواصل کی تشریح کرکے اس کا اور "اسجاع" کا فرق بھی نمایاں کیا ہے۔

(۴) "مناسبت" کا بھی بیان اعجاز القرآن میں موجود ہے۔

(۵) "تضریف" کی تشریح بھی رمّانی نے کی ہے۔

اعجاز القرآن پر سب سے بہتر کتاب ابوبکر باقلانی کی ہے۔ انھوں نے اس بحث میں بے شمار مسائلِ تنقید کو اپنا مرجع قرار دیا ہے، ان کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ پہلے کسی مسئلہ کو لے کر اس کی دقتوں کو بیان کرتے ہیں پھر شعراءِ عرب کو دکھاتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں وہ نمونہ پیش کیا ہے جس سے تمام شعراء و اہلِ زبان عاجز ہیں،

باقلانی کہتے ہیں کہ کلام مختلف حیثیت کا ہوتا ہے کچھ بلند اور کچھ پست، ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف انتقال فنکار کی عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور اکثر لوگ اس مشکل میں کامیاب نہیں ہوتے مگر قرآن مجید کی عظمت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس میں ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف اس طرح انتقال ہو جاتا ہے کہ کوئی بھدا پن اور غیر مناسب عبارت ظاہر نہیں ہوتی اور ایک عجیب حسن و کشش اس حیثیت سے قرآن مجید میں نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکثر شعراءِ عرب نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہے چنانچہ بحتری جیسا عظیم شاعر جب "نسیب" سے مدح کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اکثر بہت بھدا انداز اختیار کر لیتا ہے اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے فنی نقطۂ نظر سے[1]

[1] اعجاز القرآن تالیف ابوبکر باقلانی ص ۵۶، ۵۷۔

باقلانی کا خیال ہے کہ ایک شاعر ایک صنف میں تو غیر معمولی اہمیت اور عظمت کا حامل ہوتا ہے مگر جب وہی کسی دوسری صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتا ہے تو بہت ہی گر جاتا ہے، اور کم ایسا ہوتا ہے کہ شاعر تمام اصناف میں یکساں حیثیت رکھتا ہو، اسی طرح بعض فنکار نثر میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں مگر جب وہ شاعری میں قدم رکھتے ہیں تو بہت نیچے گر جاتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے[1]

اپنے اسی نظریہ کے پیشِ نظر وہ شعراء کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کرتے ہیں۔

(۱) کچھ شاعر ایسے ہیں جو "مدح" کے بادشاہ ہیں مگر ہجو میں بالکل صفر ہیں۔

(۲) کچھ ایسے ہیں جو ہجو بہترین کرتے ہیں مگر مدح میں ان کا کوئی مقام نہیں۔

(۳) بعض شعراء کو تقریظ (مدح) میں یدِ طولیٰ حاصل ہوتا ہے مگر وہ تابین (مرثیہ) میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(۴) کچھ شعراء تابین (مرثیہ) میں سبقت رکھتے ہیں مگر تقریظ (مدح) نہیں کر پاتے۔

(۵) اسی طرح بعض شعراء وصف میں بہت ممتاز ہوتے ہیں، اونٹ، گھوڑے، رات کے چلنے شراب پینے، جنگ کی تصویر کشی اور غزل کے رقیق موضوعات کے بیان کرنے میں بہت ممتاز ہوتے ہیں اس موقع پر باقلانی عربی تنقید کی مشہور مثل کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربوں نے یہ تبصرہ اس صلاحیت کی بنیاد پر کیا تھا کہ "امرؤ القیس سب سے بڑا شاعر ہے جبکہ وہ اونٹ پر سوار ہو، نابغہ ذبیانی سب سے بڑا شاعر ہے جبکہ وہ خوف زدہ ہو جائے اور زہیر اُس موقع پر سب سے بڑا شاعر ہے جبکہ وہ لالچ و طمع محسوس کرے اور اعشیٰ اس وقت سب سے بڑا شاعر ہے جبکہ اس نے (پی لی ہو اور) خوش ہو[2]

اس موقع پر بہت دلچسپ بحث کا آغاز باقلانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "جن" بھی اشعار کہتے ہیں، انھوں نے سترہ اشعار "جنوں" کے نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ بھی قرآن کے مثل کلام کہنے سے

---

[1] اعجاز القرآن تالیف باقلانی ص ۵۴، ۵۵

[2] 〃 〃 〃 ص ۵۴

عاجز ہیں[1] اس بحث کے دوران باقلانی نے یہ سوال اٹھایا ہی نہیں کہ ان کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اشعار انسانوں کے نہیں جنوں ہی کے ہیں اور کس طرح اُن تک یہ پہونچے - بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے عوام کی حکایات لے کر ان کو بلا تبصرہ کے شامل کر لیا جو بہرحال علمی طرزِ تحقیق کے خلاف ہے۔

باقلانی نے پہلے یہ بتایا ہے کہ اچھے اور محکم کلام کی مندرجۂ ذیل خصوصیات ہیں :-

کلام میں حسب موقع طوالت و اختصار ہو، جمع و تفریق ہو، استعارہ تصریح اور تحقیق ہو پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ اوصاف قرآن کریم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں[2]

عربی تنقید کے مشہور مسئلہ سے وہ تعرض کرتے ہیں اور الفاظ و معانی کی بحث پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جس میں معانی الفاظ کے موافق ہوں اور کلام لفظ و معنی کے لحاظ سے باہم مطابقت رکھتا ہو، ان دونوں عناصر میں سے کسی کی زیادتی نہ ہو، جب یہ کیفیت ہوگی تو فن و فصاحت کو زیادہ بہتر انداز سے نمایاں ہونے کا موقع ملے گا[3]

باقلانی نے ایک باب میں قرآن میں "سجع" کے وجود کی نفی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "سجع" میں معنی لفظ کے تابع ہو جاتے ہیں جبکہ قرآن میں الفاظ معانی کے تابع ہیں[4] احمد صقر نے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سجع کی مذکورہ تعریف صحیح نہیں ہے، اس طرز کا استعمال تو کمزور فنکاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سجع کی اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں الفاظ کو ان کی موزوں و مناسب جگہ بھی ملتی ہے اور وہ معانی کے تابع بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ "سجع" کی قسم ہے جو اپنی مکمل شکل میں احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہوئی ہے۔ اور اسی کو وہ لوگ جو "سجع" کے قائل ہیں قرآن مجید میں ثابت کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جو مسجّع کلام قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے وہ کلام کی اعلیٰ ترین قسم ہے اور بلاغت کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے[5]

---

[1] اعجاز القرآن - ص ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱ - [2] اعجاز القرآن باقلانی ص ۶۲ [3] اعجاز القرآن ص ۶۳
[4] 〃 ص ۷۶، ۸۵، ۸۶، ۱۰۰ -
[5] 〃 تالیف باقلانی مقدمہ از سید احمد صقر ص ۸۵ -

باقلانی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ بلاغت کا انحصار بدیع کی عمدہ شکلوں کے استعمال، لطیف معانی، عمدہ حکمتوں اور مناسبت اور یکسانیتِ کلام پر ہے جو قرآن مجید میں بدرجۂ اتم موجود ہے[1] آگے چل کر وہ مزید کہتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جس کو کان اپنا سرمایہ سمجھیں اور نفسِ انسانی اس کی جانب پوری طرح متوجہ ہو جائے اور جس کی رونق دور سے اس طرح نظر آجائے جیسے موتیوں کے ہار کی چمک حُسنِ کلام کی یہ صفت پہلے ہی جملہ سے ظاہر ہو جاتی ہے[2] باقلانی نے آسان اور سلیس کلام ہی کو معیار قرار دیا۔ غریب وحشی اور مستکرہ کلام کو ناپسند کرکے اچھے کلام کی تعریف اس طرح کی کہ "جب تم اس کو سنو تو وہ تمہارے دل میں بیٹھ جائے اور تم کو ایک ایسی حلاوت وخوشگواری محسوس ہو جیسی کہ تم آبِ زُلال پیتے وقت محسوس کرتے ہو، لیکن اس کے باوجود وہ کلام تمہارے اختیار سے اتنا ہی دور ہو جیسے ستارہ کے تلاشی سے ستارہ دُور ہوتا ہے،

ایسا کلام نفس سے قریب تر اور ذہن سے مانوس ہوتا ہے۔ مگر اس کا کہنا آسان نہیں ہوتا[3] پھر باقلانی یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ تمام ادباء و شعراء نے غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے[4] صرف قرآن مجید زبان کی غلطیوں سے مبرّا ہے۔

باقلانی نے قرآن سے شعر کی نفی کی ہے: باقلانی کا خیال ہے کہ شعر وہی ہے جو موزوں و مقفیٰ ہو اور اجزاء میں تناسب ہو اور وہ متساوی ہوں[5] اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ "شعر منثور" کے بھی منکر تھے۔

شاعری کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ بلا قصد کے وہ وجود میں آئی جب لوگوں نے اس کو دیکھا تو بہت پسند کیا اور اُسی انداز پر کلام کہنے کا رواج عام ہوا[6] ان کی نظر میں منظوم کلام منثور کلام سے بہتر اور فصیح ہوتا ہے (عربوں کے یہاں)[7]

باقلانی ایک موقع پر رقمطراز ہیں کہ حُسنِ کلام کا اصل مرجع انسانی طبیعت ہے جو بات عمداً کہی جائے

---

[1] اعجاز القرآن ص ۵۳، ۵۴ [2] ایضاً ص ۶۳، ۶۴ [3] ایضاً ص ۶۹ [4] ایضاً ص ۷۰۔
[5] " ص ۸۴، ۸۹ [6] اعجاز القرآن ص ۹۵، ۹۶۔
[7] " ص ۲۳۶

اس میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کیفیتِ حسن بلا قصد کے محاسنِ کلام کے استعمال ہوجانے میں ہوتا ہے۔
اس سلسلہ میں باقلانی ایک اور حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موجودہ دور (یعنی پانچویں صدی ہجری) میں لوگ آورد کے ذریعہ محاسنِ کلام کے شائق ہوگئے ہیں حالانکہ متقدمین کے یہاں ان محاسن کا ذریعہ آمد تھی۔ اور ان کا استعمال اتفاق سے ہوجاتا تھا۔[1]

تعجب تو یہ ہے کہ باقلانی نے نہ صرف یہ کہ زبان، شاعری، خطبات اور نثر وغیرہ کے تنقیدی مسائل سے بحث کی ہے بلکہ ناقد کے فرائض اور فن تنقید کے بارے میں بھی بہت سی قیمتی آراء کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرّاف کی نظر جس طرح سونے پر ہوتی ہے اور بزّاز کی نگاہ جس طرح کپڑے کو پہچانتی ہے بالکل اسی طرح ناقد کی نظر کلام پر بہت گہری ہوتی ہے۔[2]

اسی انداز سے باقلانی ناقدوں کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور مختلف مسائل زیرِ بحث لاتے ہیں۔[3]

یہ ایک مفصل نمونہ تھا ان کتابوں میں سے ایک اہم کتاب کا جو اعجاز القرآن پر لکھی گئیں، اس سے یہ بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی دقیق تنقیدی مباحث کا اثر ادبی تنقید پر پڑنا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

باقلانی کی یہ تصنیف شاید سب سے بہتر اور مسائل تنقید پر حاوی ہے اس میں اکثر مسائل ایسے ہیں۔ جو چوتھی صدی ہجری کی تنقیدی کتابوں میں موجود ہیں البتہ نظریاتی پہلو سے قطع نظر جو عملی تنقید باقلانی نے اس ضمن میں پیش کی ہے کہ تمام عربی شاعری میں غلطیاں موجود ہیں اور اس سلسلہ میں امرؤ القیس کے قصیدہ کے ایک ایک شعر کو لے کر اس کی غلطیاں واضح کرنے کی کوشش کی ہے[4] وہ تنقید اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید کی زبان اور اس کے بیان کے محاسن کا تفصیل سے ذکر کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کی زبان سب سے اہم اور اعجاز کا نمونہ ہے جس سے انسان عاجز ہیں۔

---

[1] اعجاز القرآن ص ۲۷۶، ۲۷۷۔ [2] اعجاز القرآن ص ۱۷۲ [3] اعجاز القرآن ص ۱۷۲ تا ۱۷۸
[4] اعجاز القرآن ص ۲۴۹، ۲۵۰۔

قرآن مجید پر جن لوگوں نے لکھا اور اس کی زبان اور اس کے اسلوب پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ان سب ناقدوں یا علماء نے کوئی ایک نہج اپنی بحثوں میں اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے ذہن و خیال اور اپنے زمانہ کے تنقیدی رجحانات کے پس منظر میں انھوں نے قرآن مجید کے محاسنِ زبان کو سامنے لانے کی کوشش کی، اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر زغلول سلام کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ عربوں کے دو مکتبِ فکر تھے علمِ تنقید میں ایک "مذہب بدیع" اور دوسرا ان لوگوں کا جو قرآن مجید کو تنقید کا مرجع سمجھتے تھے، چنانچہ وہ "مذہب بدیع" اور "مذہب عربی" کو دو اہم تنقیدی رجحانات سمجھتے ہیں، یہ تقسیم تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں دونوں مکتب ہائے فکر کا صحیح نقشہ موجود نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ پاتے کہ "مذہب بدیع" قرآن سے دور رہا اور "مذہب عربی" کا مرکز قرآن مجید رہا بلکہ طُرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ قرآن اصحابِ بدیع کا محور بن گیا اور انھوں نے جتنے بھی تنقیدی پیمانے بنائے ان کا معیار قرآن اور اعجازِ قرآن کو قرار دیا اور راہ سے ہٹ گئے جس کی جانب علماءِ اعجازِ قرآن نے ان کو توجہ دلائی اور بتایا کہ قرآن مجید کے اسلوب میں محض فنونِ بدیع ہی اس کی عظمت کے حامل نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں معانی اور روحِ بیان وغیرہ ہیں جو ایک توازن اور کشش کی ضامن ہیں[1]

قرآن مجید کو علمِ بدیع کے حامیوں نے اپنے اوپر اعتراضات سے بچنے کے خیال سے مرجع بنایا اور یونانیوں سے نظریات اخذ کر کے انہیں قرآنی مثالوں کے ساتھ پیش کیا، اس سے یہ ایک بڑا فائدہ ہوا کہ ایک جانب عربی تنقید میں نظریاتی پہلو کا اضافہ ہوا اس لئے کہ اب تک جو تنقید عربوں کے یہاں موجود تھی وہ دراصل عملی تنقید تھی اور سطحی فکر و ذوق پر منحصر تھی اس طرح عربوں میں ایک بلند اور نظریاتی و فکری تنقید کی بنیاد پڑی، دوسری جانب عربی تنقید کو یہ فائدہ پہنچا کہ قرآن مجید کے استشہاد کی وجہ سے عربوں نے کچھ دن ضرور غیر عربی خیالات سے اجنبیت محسوس کی اور آمدی نے قدامہ کے نظریات کے خلاف کتاب لکھی، اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے جنھوں نے اعجازِ قرآن پر کتابیں تصنیف کیں انھوں نے

---

[1] اثر القرآن ص ۳۳۷

عرب مکتبِ فکر اور یونانی مکتبِ فکر دونوں کے اختلافات سے قطع نظر کرکے قرآن مجید کے محاسن کو اُجاگر کرنے کے لئے دونوں ہی خیالات سے فائدہ اٹھایا جیسا کہ باقلانی کی کتاب سے محسوس ہوتا ہے

اس وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ زغلول سلام نے قرآن پر اس حیثیت سے غور نہیں کیا کہ علماءِ اعجازِ قرآن خود کسی مسلک کے حامل نہ تھے بلکہ اپنے دور کے مروّجہ تمام مسالک سے وہ قرآن مجید کے محاسن کو واضح کرنے کی کوشش کرتے تھے اگر مذہب عربی کا مرکز صرف قرآن ہی ہوتا تو آمدی کے یہاں ہم کو علمِ بدیع اور اس کی اقسام نظر نہ آتیں، خود باقلانی نے بدیع اور اس کی اقسام سے بحث کی ہے اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی عظمت کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس بحث سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ علماءِ اعجازِ قرآن کا کوئی الگ مکتبِ فکر عربی تنقید میں نہ تھا بلکہ وہ مذکورہ دونوں تنقید کے اسکولوں سے استفادہ کرتے تھے، اس طرح یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ عربی تنقید کے دونوں مکتب ہائے فکر پر قرآن مجید کے اثرات نمایاں ہیں اور یہ نظریہ صحیح نہیں کہ کوئی بھی مکتبِ فکر قرآن مجید سے دُور رہا۔ زغلول سلام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدیع مکتبِ فکر کا مرجع چونکہ یونانی خیالات تھے لہٰذا وہ قرآن مجید کے اثرات سے دُور رہا، اس کے برعکس عربی مکتبِ خیال کے ناقدوں نے اپنا مرجعِ فکر قرآن مجید کو بنایا اور قرآن مجید کے اسلوبِ بیان ہی کو مضبوطی سے پکڑے رہے، عربی تنقید میں یہ خالص قرآنی طرزِ فکر ان کی نظر میں بدیع اسکول اور یونانی خیالات کا عملی طور پر ردِّ عمل تھا اور بدیع مکتبِ فکر کے مقابلہ میں عربی مکتبِ فکر وجود میں آیا۔[1]

یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ عربی تنقید کے تمام مکاتبِ فکر نے قرآن مجید سے استشہاد کیا ہے اور اسی کو زبان و بیان کا نمونہ بنایا ہے، مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کے جس خالص مکتبِ فکر کی جانب زغلول سلام اشارہ کرتے ہیں اس میں تو ذرا بھی کہیں قرآن کا اثر نمایاں نہیں ہے مثلاً تیسری صدی

---

[1] اثرالقرآن فی تطور النقد الأدبی ص ۳۳۳، ۳۳۴

ہجری میں ابن قتیبہ نے "الشعروالشعراء" میں جو تنقیدی بحثیں کی ہیں ان میں تمام استشہاد قدماء و محدثین کے اشعار سے کیا گیا ہے یہی حال ابوالعباس ثعلب کی "قواعد الشعر" کا ہے، آمدی اور قاضی جرجانی جن کو ڈاکٹر محمد مندور خالص عرب ناقد قرار دیتے ہیں[1] وہ بھی "موازنہ" اور "وساطہ" میں قرآن سے استشہاد نہیں کرتے بلکہ واقعہ تو یہ ہے "قرآن مجید کو نمونہ کے طور پر جن لوگوں نے پیش کیا ان میں اکثریت انہیں ناقدوں کی ہے جن کا تعلق "مذہب بدیع" سے ہے"۔

ثعلب اور ابن قتیبہ بھی قرآن ہی کو اپنا مرجع و ماخذ سمجھتے تھے لیکن شاعری پر بحث کے دوران انھوں نے قرآن مجید کو مثالاً نہیں پیش کیا جبکہ بدیع اسکول کے ناقدوں نے اپنی کتابوں میں عربی شاعری اور قرآن مجید دونوں ہی سے مثالیں تلاش کیں، ابن قتیبہ نے "مشکل القرآن" میں قرآن مجید کی زبان کو دنیا کی تمام زبانوں پر ترجیح دی اور افضل بتایا ہے[2]

زغلول کے نظریہ پر میں نے اس لئے یہ بحث کی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی فکر میں "بدیع یا یونانی" اسکول تنقید سے وہ تعصب موجود ہے جس کا ابوتمام کے زمانہ سے اکثر عرب ناقد شکار رہے ہیں، ورنہ قرآن مجید کے اثرات تو عربی تنقید کے بنیادی عناصر میں ہیں اور جس سے پوری عربی تنقید نے قوت اور توانائی حاصل کی ہے۔

---

[1] النقد المنھی عندالعرب ص ۶۸ [2] اثرالقرآن ص ۱۱۹، ۱۱۰

وحی الٰہی

وحی اور اس سے متعلق مباحث پر محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ کے ایک ایک پہلو پر ایسے دل پذیر و دل کش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے اور حقیقتِ وحی سے متعلق تمام خلشیں صاف ہو جاتی ہیں۔ تالیف:۔ مولانا سعید احمد ام اے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ، کتابت نفیس چمکتی ہوئی طباعت عمدہ۔ صفحات ۲۰۰ قیمت تین روپئے مجلد چار روپئے۔

پتہ:۔ مکتبۂ برہان اردو بازار جامع مسجد دھلی ۶